٦

عمرانی نظریات کی تدریس اور مشرقی مفکرین

سید فرید العطاس

استشراقیت (اورینٹلزم) تعلیمی مواد کی تشریح و توضیح اس طرح کرتی ہے کہ عمرانی علوم کے مبادیات اور متبادل نقطہ ہائے نظر کے سوالات کی حیثیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے نہ آئے۔ موضوعیت کی یہی کمی ہے جو اس امر کو ناممکن بنا دیتی ہے کہ غیر یورپی مفکرین کے کاموں کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جائے گی جتنی کہ مارکس، ویبر، درخائم (Durkheim) اور دیگر یورپی و امریکی سماجی مفکرین کے کاموں کو دی جاتی ہے۔ استشراقیت سوچنے کا ایک انداز ہے جو یورپ کے باشندوں تک محدود نہیں ہے۔ تیسری دنیا میں سماجی علوم 'یورپی مرکزیت' (Eurocentric) انداز میں پڑھائے جا رہے ہیں۔ اس نے عمرانی ماہرین کی مقامی و علاقائی دانشورانہ روایات سے بیگانگی کو جنم دیا ہے۔ مزید برآں، عمرانیات اور دیگر عمرانی علوم کے نصاب نے عام طور پر غیر مغربی مفکرین کو متعارف کروانے کے ذریعے مستشرقین کے تعصب کو ختم کرنے کی چنداں کوشش نہیں کی۔ اگر ہم انیسویں صدی کو ایک مثال کے طور پر سامنے رکھیں تو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اس عرصے میں مارکس، ویبر، درخائم اور دیگر یورپی مفکرین معاشرے کی فطرت اور اس کو آگے بڑھانے کے لیے سوچ بچار کر رہے تھے اور اس عرصے میں ایشیا اور افریقہ میں کسی مفکر نے جنم تک نہیں لیا۔

غیر یورپی مفکرین کی عدم موجودگی ان معاملات میں زیادہ معنی خیز معلوم ہوتی ہے جہاں غیر یورپی مفکرین سماجی افکار کی ترقی میں درحقیقت اثر انداز ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر سماجی افکار کی

تاریخ، ان کا برتاؤ اور نظریے کا موضوع مونتیسکیو (Montesquieu)، ویکو (Vico)، کومتے (Comte)، اسپینسر (Spencer)، مارکس (Marx)، ویبر (Weber)، درخائم (Durkheim)، سیمل (Simmel)، تونیس (Toennies)، سومبارٹ (Sombart)، مانہیم (Mannheim)، پاریتو (Pareto)، سمنیر (Sumner)، وارد (Ward)، اسمال (Small) اور دیگر مغربی مفکرین کا احاطہ کرے گا۔ بالعموم غیر مغربی مفکرین کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

یہاں استشراقیت کے مابین اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے جو انیسویں صدی کی فکر سے مطابقت رکھنے والے 'مشرق' کے واضح طور پر دقیانوسی تصور اور اب عہد جدید میں غیر مغربی آوازوں کو حقیر جاننے اور انہیں خاموش کرانے کی جدید مشرقیت کے درمیان منقسم ہے۔ اگر کسی صورت کچھ غیر یورپی تحریریں اور نصاب نظروں میں آتا بھی ہے تو وہ یورپی دانشوروں کی تحقیق کے تابع ہوتا ہے، عمرانی نظریات و خیالات کے مصادر کے بارے میں ان مضامین کے خالق کچھ نہیں جانتے۔ غیر مغربی مفکرین کو خاموش کرانے اور انہیں دیوار سے لگانے کا مطلب یہی ہے۔

عمرانی نظریے کی تدریس: قواعد کی آفاقیت

لہٰذا یہ مناسب لگتا ہے کہ غیر یورپی پس منظر کے حامل سماجی مفکرین کی مثالیں پیش کی جائیں جنہوں نے قدیم عمرانیات کے نظریات اور اصولوں کا امتیازی نشان بننے والے موضوعات اور مسائل پر نظریہ سازی کی جو وسیع البنیاد عوامل کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے دلچسپی کے حامل ہیں۔ میں اپنے تدریسی عمل میں ابن خلدون (تیونس) اور جوس رزال (فلپائن) پر توجہ مرکوز رکھے ہوئے ہوں۔ میں موخرالذکر کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ان کا کام ہم جنوب مشرقی ایشیا میں رہنے والوں کے لیے بالخصوص بہت دلچسپی کا حامل ہے۔

فلپائن سے تعلق رکھنے والے مفکر اور سرگرم عمل کارکن جوس رزال (۱۸۶۱ء تا ۱۸۹۶ء) جنوب مشرقی ایشیا کے غالباً پہلے سماجی مفکر تھے۔ انہوں نے حقیقی مسائل کو اجاگر کیا اور ان مسائل کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت تخلیقی انداز کا تھا۔ وہ عمرانیات کے اس عہد میں تھے جب وہ صورت گری کے دور سے

گزر رہا تھا لیکن انہوں نے معاشرے کی فطرت کے بارے میں جس طرح نظریات پیش کیے، ویسے مغربی ماہرین عمرانیات نے بھی نہیں کیے۔ وہ انیسویں صدی میں ابھرتی ہوئی جدیدیت کے نوآبادیاتی تناظر میں ہمارے سامنے مختلف نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔

رزال ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈومینکن آرڈر سے ملنے والی زمین پر گنے کاشت کیا کرتے تھے۔ نتیجتاً رزال کو منیلا میں بہترین تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم انتینیو دی منیلا یونیورسٹی اور اس کے بعد سانتو توماس میں جاری رکھی۔ ۱۸۸۲ء میں رزال اسپین چلے گئے جہاں انہوں نے میڈرڈ کی یونیورسڈاڈ سینترال میں علم الادویہ اور علومِ انسانی میں تعلیم حاصل کی۔

رزال ۱۸۸۷ء میں فلپائن واپس آئے۔ اسی سال ان کا پہلا ناول Noli Me Tangere (مجھے مت چھوؤ) شائع ہوا۔ یہ ناول ہسپانوی نوآبادیاتی سرکار کی جانب سے کیے گئے عوام کے استحصال کی عکاسی کرتا تھا اور اس نے ہسپانوی حکام کو سخت مشتعل بھی کیا۔ یہ ناول فلپائنی معاشرے کے مسائل کی تشخیص اور نوآبادیاتی معاشرے کے استحصال سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھرپور عکاس تھا۔ ان کا دوسرا ناول El Filibusterismo (انقلاب) ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا، جس نے انقلاب کے امکانات اور نتائج کا جائزہ لیا۔

اگر ہم رزال کے ادبی کام کی بنیاد پر کوئی عمرانیاتی نظریہ کھڑا کرنا چاہیں تو ان کی تصانیف سے تین بڑے پہلوؤں کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اول، ہمیں ان نوآبادیاتی معاشروں کا نقطۂ نظر ملے گا جو نوآبادیاتی معاشرے کی فطرت اور حالات کو ظاہر کرتا ہے، دوئم، فلپائن کی نوآبادیاتی عہد کی معلومات پر رزال کی تنقید۔ آخر میں آزادی کے معنی اور ضروریات پر ان کا مباحثہ ملتا ہے۔

رزال کے خیال میں بدعنوان ہسپانوی نوآبادیاتی حکومت اور اس کے عہدیداران نے فلپائنی باشندوں پر بدترین مظالم ڈھائے اور ان کا بھرپور استحصال کیا، اور ساتھ ساتھ ان نوآبادیاتی قوتوں نے مقامی فلپائنی باشندوں پر مبینہ سستی و کاہلی کا الزام عائد کرتے ہوئے اسی کو ان کی پسماندگی کا سبب

قرار دیا۔لیکن رزال نے ثابت کیا کہ درحقیقت فلپائنی معاشرہ نوآبادیاتی عہد کے آغاز سے قبل زیادہ جدید معاشرہ تھا اور اس کی پسماندگی درحقیقت نوآبادیاتی نظام کی پیداوار تھی۔انہوں نے فلپائنی تاریخ کی ازسرنو تفہیم کی ضرورت پر زور دیا۔

رزال کے عہد میں ہسپانوی نوآبادیاتی مفکرین بلکہ خود فلپائنی اہلِ علم کی جانب سے بھی فلپائن کے بارے میں موجود معلومات کی حالت زار پر کم ہی تنقید کی گئی۔رزال، جو یورپ میں مستشرقانہ علوم سے بخوبی واقف تھے، اس امر سے آگاہ تھے جسے آج مستشرقانہ بناوٹ کہتے ہیں۔اسے ان کی شرح نویسی اور انتونیو دی مورگا (Antonio de Morga) کی کتاب Sucesos de las Islas Filipinas (جزائر فلپائن کے تاریخی واقعات) کی اشاعت ثانی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو پہلی بار ۱۶۰۹ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ ہسپانوی دی مورگا نے لیفٹیننٹ گورنر جنرل اور کیپٹن جنرل کی حیثیت سے فلپائن میں آٹھ سال خدمات انجام دی تھیں اور منیلا میں سپریم کورٹ کے جسٹس بھی رہے تھے۔

رزال نے اپنی شرح نویسی کے ساتھ اپنے کام کو دوبارہ شائع کیا تاکہ غلط فہمی کا خاتمہ اور بیشتر ہسپانوی تصانیف میں فلپائن کے حوالے سے ہتک آمیز بیانات کے مطابق درستی کر سکیں، ساتھ ساتھ انہوں نے قبل از نوآبادیاتی عہد کے دور پر بھی روشنی ڈالی جس کی یادیں نوآبادیاتی نظام نے فلپائنی باشندوں کے ذہنوں سے محو کر دی تھیں۔اس میں ہسپانوی آمد سے قبل کے ریکارڈز کو تباہ کرنا بھی شامل تھا کیونکہ انسانی ہاتھوں سے بنائے گئے فن پارے نوآبادیاتی عہد سے قبل کے معاشرے کی فطرت پر روشنی ڈالتے۔ رزال نے دی مورگا کے کام کو درست انتخاب قرار دیا کیونکہ اوکامپو کے مطابق یہ ہسپانوی نوآبادیاتی عہد میں لکھی گئی فلپائن کی واحد شہری تاریخ تھی، دیگر ادبی کام زیادہ تر کلیسائی تاریخ پر مبنی تھا۔کلیسائی تاریخوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دروغ گوئی اور بہتان طرازی کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ شیطانوں، معجزات اور بھوت پریت کی کہانیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔فلپائن کی ضخیم تاریخ کا بڑا مجموعہ انہی پر مشتمل ہے۔اس لیے رزال کے لیے فلپائن کی دستیاب تاریخی کتب ناقص و متعصب اور ساتھ ساتھ غیر علمی اور نامعقول تھیں۔رزال کی شرح نویسی نے مندرجہ ذیل کامیابیاں حاصل کیں:

۱۔ انہوں نے نوآبادیاتی عہد سے قبل زراعت وصنعت میں فلپائنی باشندوں کی ترقی کی مثالیں پیش کیں۔

۲۔ انہوں نے مختلف معاملات پر نوآبادیاتی نقطہ نظر پیش کیا۔

۳۔ انہوں نے نوآبادیاتی سرکار کی جانب سے ڈھائے گئے مظالم کی نشاندہی کی۔

۴۔ انہوں نے نوآبادیاتی حاکموں کی منافقت کا پردہ چاک کیا، خصوصاً کیتھولک گرجے کا۔

۵۔ انہوں نے نوآبادیاتی موضوعات پر چرچ کے بیانات کی نامعقولیت سے پردہ اٹھایا۔

رزال نے توجہ دلائی کہ 'غلام اقوام کی بدحالی کا الزام عام افراد پر نہیں بلکہ ان کے حاکموں پر لگنا چاہیے (رزال، ۱۹۶۳ء ب: ۳۱)۔ رزال کے ناولوں، سیاسی تحریروں اور خطوط نے اس کی مثالیں پیش کی ہیں مثلاً جائیداد کی قرقی، کاشتکاروں کی نامناسب اجرت، بھاری محصولات، جبری مشقت وہ بھی بلا ادائیگی وغیرہ۔ نوآبادیاتی حکومت اور کیتھولک چرچ کے دعووں اور ارادوں کے باوجود نوآبادیاتی پالیسی استحصالی نوعیت کی تھی۔ درحقیقت رزال ان سے سخت بیزار تھے جو خود ان کے الفاظ میں ''بزعم خود خدائی فوجدار بن جانے والوں [راہبوں] اور نور کے مبلغین جو نہ خود عیسائی اخلاقیات میں ڈھلے ہوئے تھے اور نہ ہی ڈھال سکتے تھے، انہوں نے مذہب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، بلکہ رسوم ورواج اور توہم پرستی کے حامل تھے۔'' (رزال، ۱۹۶۳ء ب: ۳۸)

ان حالات میں رزال نے ضرورت محسوس کی کہ فلپائنی باشندوں کی نوآبادیاتی معلومات پر تنقید کی جائے۔ انہوں نے فلپائنی باشندوں کی مبینہ سستی وکاہلی کے علاوہ دیگر نوآبادیاتی الزامات کا جواب دینے کے لیے تاریخ کے صفحات کو کھنگالا۔ اس نے آزادی وانقلاب کے لیے ممکنات کو سمجھنے کا راستہ ہموار کیا۔

فلپائنی باشندوں کی سستی وکاہلی کا مفروضہ

فلپائنی تاریخ کی نئی تعبیر کو ذہن میں رکھتے ہوئے رزال نے مقامی باشندوں کی کاہلی وسستی پر ہونے والی بحث پر تنقید کا بیڑہ اٹھایا، جو ہسپانویوں کی پھیلائی ہوئی بحث تھی۔ کاہلی کا موضوع اہم تھا

کیونکہ اس نے نوآبادیاتی سرمایہ داریت کے تصور کا اہم حصہ تشکیل دیا تھا۔ رزال غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے باقاعدہ اس کا سامنا کیا۔ اس معاملے کو بعدازاں سید حسین العطاس نے اپنی اہم کتاب ''کاہل مقامی باشندوں کا افسانہ'' (۱۹۷۷ء) میں اٹھایا، جس میں ایک باب ''فلپائنی باشندوں کی آرام طلبی'' رزال کے اسی عنوان سے پیش کردہ مقالے کو خراج تحسین تھا۔

رزال کی عمرانیات کی بنیاد دراصل آرام طلب و کاہل فلپائنی باشندوں کے اس افسانے پر تنقید ہی تھی۔ یہ تنقیدی نقطۂ نظر اور نظریہ یہ ہے کہ فلپائنی معاشرے کی پسماندگی کا سبب فلپائنی خود نہیں بلکہ نوآبادیاتی حکومت کی فطرت تھی، جو دفتر شاہی نظام اور نوآبادیاتی انتظامیہ کے خلاف رزال کی تنقید کو سمجھنے کے لیے بہتر پس منظر پیش کرتی ہے۔

اپنے مشہور مقالے ''فلپائنی باشندوں کی آرام طلبی'' میں وہ اس کی تعریف 'کام سے کم محبت، اور محدود سرگرمی' کے طور پر کرتے ہیں (رزال، ۱۹۶۳ء الف: ۱۱۱)۔ اس کے بعد وہ آرام طلبی کے حوالے سے دو باتیں کرتے ہیں۔ اول: آرام طلبی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی صورت میں — جس کا سبب فلپائن کا منطقہ حارہ کا گرم موسم ہے جو فرد کو کام چھوڑ کر آرام پر مجبور کرنے کا سبب ہے، بالکل ویسے ہی جیسے سرد موسم اسے کام کرنے اور حرکت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ رزال کی دلیل یہ ہے:

''درحقیقت منطقہ حارہ کے ممالک میں سخت محنت کرنا سرد ممالک کی طرح مناسب نہیں، یہاں ایسا کرنے کا مطلب خود کو نقصان پہنچانا، موت کو دعوت دینا اور برباد ہونا ہے۔ فطرت کو بھی اس چیز کا علم ہے اس لیے سخت موسم کے بدلے میں اس علاقے کو زیادہ زرخیز اور زبردست پیداوار کا حامل بنایا۔ تپتی دھوپ میں ایک گھنٹے کام کرنے کا پھل نسبتاً ٹھنڈے ممالک میں دن بھر کے کام کرنے کے برابر ملتا ہے؛ اور زمین کی پیداوار ان کے مقابلے میں ۱۰۰ گنا زیادہ ہے! پھر، کیا ہم نہیں دیکھتے کہ بڑے سرگرم نظر آنے والے یورپی باشندے موسم سرما میں اپنی قوت کو مجتمع کرتے ہیں، جن کے خیال میں موسم بہار میں تازہ خون ان کی رگوں میں دوڑے گا۔ کیا ہم بدلتے موسموں میں انہیں کام کاج چھوڑ کر اور اپنے دفاتر بند کرتے نہیں دیکھتے، حالانکہ وہاں

کام کرنا یہاں کی طرح اتنا مشکل بھی نہیں۔ بیٹھ کر باتیں کرنا اور میز کرسی سے چپکے رہنا وہاں تو بس یہی کام ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ساحل سمندر کا رخ کرتے ہیں، قہوہ خانوں میں محفلیں جماتے ہیں، مٹرگشت کرتے ہیں۔ تو بھلا اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ منطقہ حارہ کے ممالک میں رہنے والے طویل اور انتہائی گرمی میں خون پسینہ بہانے کے بعد آرام کریں؟'' (رزال، ۱۹۶۳ء الف: ۱۱۳)

رزال کا پیش کردہ نقطۂ نظر دراصل منطقہ حارہ کے گرم موسم کا جسمانی ردعمل ہے، جو سید حسین العطاس کے مطابق رزال کی آرام طلبی کی اپنی تعریف پر بھی پورا نہیں اترا یعنی 'کام سے کم محبت'۔ کام کرنے کی عادات کی مقامی سخت موسم سے مطابقت کو آرام طلبی اور کام سے کم محبت نہیں سمجھنا چاہیے۔

رزال کے آرام طلبی کے اس نظریے کا ایک دوسرا پہلو ہے جو زیادہ اہم اور عمرانیاتی لحاظ سے زیادہ واضح بھی ہے۔ وہ ہے اصطلاح کے حقیقی معنوں میں آرام طلبی، کام سے کم محبت یا کام میں تحریک وترغیب کا فقدان:

''مسئلہ یہ نہیں کہ آرام طلبی زیادہ یا کم دونوں صورتوں میں موجود ہے، بلکہ یہ ہے کہ اسے فروغ دیا گیا اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ انسانوں میں انفرادی واجتماعی دونوں سطح پر میلان و رغبت ہی نہیں بلکہ اچھائی و برائی کی طرف رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اگر عام سوچ ان کی توجہ حاصل نہ کرے تو اچھائی کا فروغ اور اس کی حوصلہ افزائی اور ساتھ ساتھ برائی پر گرفت اور اس کی حوصلہ شکنی کرنا معاشرے یا حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ آرام طلبی کو فلپائن میں مبالغہ آرائی کی حد تک بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، یہ ایک ایسی برائی بن گئی ہے جسے ہر گزرتے عہد کے ساتھ دوگنا کر کے پیش کیا جا رہا ہے، یہ بدانتظامی اور پسماندگی کا اثر ہے، اس کا سبب نہیں ہے۔'' (رزال، ۱۹۶۳ء الف: ۱۱۴)

گلبرٹو فریئر نے برازیل کے تناظر میں بالکل یہی نکتہ اٹھایا تھا:

''اور جب میگوئیل پیریرا اور بیلس ریو پینا نے کابوکلوس کی عملاً ناکارہ آبادی اور ہلکی رنگت کے

حامل ملاٹوس کو اقتصادی بدحالی اور غیر پیداواری جمود کے حال میں دریافت کیا، جن کی حیثیت اس وقت معاشی قوت کے بجائے ایک طبی مواد کی سی تھی اس صورت میں وہ ہماری نسل کے خالص نہ ہونے کا رونا رونے بیٹھ جاتے ہیں اور برازیل کے گرم موسم والا علاقہ نہ ہونے کے باوجود اس بدحالی اور آرام طلبی کو سفید فام مردوں اور سیاہ فام عورتوں کے درمیان اختلاط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، یعنی پرتگیزی مردوں اور مقامی ہندی خواتین کے درمیان۔ بالفاظ دیگر نااہلی اور آرام طلبی کا سبب نسل ہے۔''

''اس کا تعلق عمرانیات کے مخصوص مکتبہ فکر سے کم ہی ہے۔ اس کا تعلق جبر یا مختلف نسلوں کی آمیزش سے نہیں بلکہ سماجی اسباب کے مقام میں موسمیاتی اثرات سے زیادہ ہے، جو نہ تو قابو میں ہیں اور نہ ہی انہیں بہتر بنایا جاسکتا ہے؛ پھر سب سے بڑھ کر آزاد افراد پر مشتمل دونسلی آبادی پر بھی دباؤ رکھا گیا۔ واحد ثقافت اور جبری مشقت کے نظام کے ذریعے، اشیائے خورونوش کی قلت کے ذریعے، اسی طرح مقامی خوراک کی کمی کو خاطر ہی میں نہ لایا گیا جو یہ افراد اور تمام ہی برازیلی باشندے تین صدیوں یا اس سے زائد عرصے سے استعمال کر رہے تھے۔ یوں غذائی رسد کی بے ضابطگی کی باقاعدہ نگرانی کی گئی اور ایسی مصنوعات کی حفاظت و تقسیم میں حفظان صحت کے اصولوں کو کم ہی اہمیت دی گئی۔'' (فریئر، ۱۹۵۶ء: ۴۸)

رزال کا اہم عمرانیاتی کارنامہ آرام طلبی کے اس مسئلے پر سوال اٹھانا اور ساتھ ساتھ موضوع کے متعلق اپنے طریقے کو بھی پیش کرنا تھا، بالخصوص ان کا نظریہ کہ آرام طلبی فلپائنی معاشرے کی پسماندگی کا سبب نہیں۔ اس کے بجائے فلپائن کے نوآبادیاتی معاشرے کی پسماندگی اور بگاڑ اس آرام طلبی کا سبب بنا۔ رزال کے لیے فلپائنی باشندوں کی آرام طلبی ہسپانوی اقتدار کا سماجی و تاریخی نتیجہ تھی۔ ہم رزال کو ساتھ لے کر اس مسئلے کو ایک مرتبہ پھر اٹھا سکتے ہیں کہ کیا یہ آرام طلبی ہی تھی یا استحصالی حالات میں کام سے عدم رغبت اور بے اعتنائی؟ البتہ اہم بات یہ ہے کہ رزال نے معاملے سے اصولی انداز میں نمٹنے کی کوشش کی۔ رزال نے صدیوں قبل لکھی گئی یورپی باشندوں کے پیش کردہ تاریخی حوالوں کی جانب

اشارہ کیا جنہوں نے فلپائنی باشندوں کو محنت کش دکھایا تھا۔ اس میں دی مورگا کی تحریر بھی شامل ہے۔ اس لیے آرام طلبی کے ضرور کوئی سماجی اسباب ہوں گے اور انہیں نوآبادیاتی اقتدار کی روح میں تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ رزال، فریئر کے ساتھ اس امر پر متفق ہوں گے کہ:

''یہ ''فروتر نسل'' کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک نسل کی جانب سے دوسری نسل کا بدترین استحصال تھا، یہ گھٹیا برتاؤ تھا جو نیگرو باشندوں سے غلامانہ اطاعت کا مطالبہ کرتا تھا کہ وہ اپنی زمینوں کے مالک بن جانے والے طاقتور افراد کی بھوک مٹانے کے لیے کام کریں۔'' دولت بغیر کسی محنت کے حاصل کرنے'' کی اس روش نے کاہلی و سستی کو فروغ دیا.....'' (فریئر، ۱۹۵۶ء: ۳۲۹)

فریئر کی رائے میں یہ غلام نہیں بلکہ آقا تھے جو سست اور کاہل تھے۔ انہوں نے حوالہ دیا کہ غلام تو آقا کے اقتصادی مفادات اور عیش و عشرت کے لیے کام میں جتے ہوئے تھے۔

عمرانی نظریے کی تدریس: تعصب کی اصلاح

عمرانی نظریے پر ''یورپ مرکزی'' تعصب کی اصلاح کرنے والے نصاب کو صرف غیر مغربی مفکرین پر ہی توجہ مرکوز نہیں کرنی چاہیے۔ اسے ان مغربی مفکرین سے بھی ناقدانہ انداز میں نمٹنا چاہیے جنہوں نے قواعد ترتیب دیے۔ اسی پر میری ساتھی ونیتا سنہا اور میں نے سماجی افکار اور سماجی نظریے کو بنیاد بناتے ہوئے نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور میں اپنا نصاب ترتیب دیا، جس پر بحث جریدے Teaching Sociology (العطاس اور سنہا، ۲۰۰۱ء) میں کی گئی۔ ذیل میں ہونے والی بقیہ گفتگو اسی مقالے سے لی گئی ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ 'مغربی' مصادر سے آنے والی تحریریں جنہیں عمرانیاتی نظریے میں مجموعے کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، ہماری نظر میں یورپ مرکزیت کے موضوع کو سمجھنے میں اہم اضافی نکتہ فراہم کریں گی اور ہمیں بامعنی و مجاز دلائل دیں گی۔ ہماری جانب سے 'یورپی مرکزیت' (Eurocentrism) کی اصطلاح کے استعمال پر کچھ تاکید ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ

اپنے ادبی اور عام معنی یعنی ''یورپ کا مرکزی ہونا'' (Europe-centredness) سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہمارے خیال میں یورپی مرکزیت کی اصطلاح ایک مخصوص مقام، تناظر، دیکھنے یا نہ دیکھنے کے ضمنی معنی دیتی ہے جس کی جڑیں مختلف مشکل دعووں اور مفروضات میں پیوست ہیں۔ ہم پر کھے گئے تین مفکرین مارکس، ویبر اور درخائم کو مقرر کر کے اپنے لیے 'یورپی مرکزیت' کی اصطلاح کے عام استعمال کو بھی لازمی نہیں ٹھہراتے۔ درحقیقت ہم نے جان بوجھ کر مخصوص اور مختلف طریقوں کے لیے کام کیا جن کے ذریعے ہم زیرِغور نظریات کو جان سکیں کہ یہ 'یورپی مرکزی' ہیں یا نہیں۔ ہم مزید جانتے ہیں کہ مارکس، ویبر اور درخائم کی تحاریر میں 'یورپی مرکزیت' کو پہچاننا کوئی حیران کن امر نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نئی دریافت ہے۔ پھر بھی عمرانی علوم میں ان موضوعات کی قدامت کے باوجود یورپ مرکزیت پر تنقید میں نہ تبدیلی آئی ہے اور نہ ہی اس نے نئی ساخت اختیار کی ہے جس میں قدیم عمرانیاتی قواعد کی نظریہ کاری کی جا سکے۔ اس لیے 'جاننے' کے باوجود مارکس، ویبر اور درخائم کی چند تحریریں 'یورپی مرکزی' ہیں اور نتیجتاً ہمارے عہد کے مطالعے پر وہ کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں، اس کو اب تک نہیں چھیڑا گیا اور نہ ہی اس پر نظریات کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ ہم اپنے طلبہ پر واضح کرتے ہیں کہ مارکس، ویبر اور درخائم کی کتب کو یورپ مرکزی یا مستشرقانہ قرار دینے کے لیے یہ رائے نہ پیش کریں کہ یورپی نظریہ سازوں کے لیے مشرق کے بارے میں ایسی آراء دینا ممکن بھی تھا یا نہیں۔ بہرحال، یہ کتب ان کے عہد کی پیداوار ہیں۔ البتہ اپنے وقت کے زاویہ نظر سے ان کی دیگر کتب کا مطالعہ ممکن ہے۔

ان معاملات پر ہم نے یورپ مرکزیت پر والرسٹائن کا ایک مضمون مختص کیا۔ یورپ مرکزی تاریخ نویسی انہی اسباب کے تابع ہوتی ہے جن میں ان عوامل کو جن میں یورپ کو غلبہ حاصل ہوا اور اس کا مقام بلند و بالاتر ہو (جیسا کہ نوکر شاہی، سرمایہ داری، جمہوریت وغیرہ) پیش کیا گیا اور انہیں ایسی اصطلاحات و خصوصیات کے ساتھ بیان کیا گیا جو یورپ کے باشندوں کے لیے ہی مخصوص تھیں۔ اسی لیے یورپ خود کو اس لحاظ سے انوکھی تہذیب سمجھتا ہے کہ وہ جدیدیت اور فرد کی خودمختاری و آزادی (بشمول خاندانی، برادری، ریاستی، مذہبی آزادی وغیرہ) کی جنم بھومی تھا اور اس لیے اس ترقی کو ہر جگہ

پھیلنا چاہیے اور یہی چیز سماجی علوم میں جڑیں مضبوط کر گئی۔ مزید برآں، سماجی علوم کے نظریات نے فرض کر لیا کہ یورپ میں جدید سرمایہ دارانہ معاشروں کا قیام نہ صرف اچھا ہے بلکہ اسے عالمگیر سطح پر ہر جگہ دہرایا جائے گا اور اس لیے یہ سائنسی نظریات ہر زمان و مکان میں درست ہیں۔

اس منصوبے میں ہمارا مقصد رزال اور ان جیسے دیگر 'بابائے' عمرانیات ہی کو نہیں بلکہ اس امر کو بھی دیکھنا ہے کہ 'مغربی' سماجی علوم کی یورپ مرکزیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں مارکس، ویبر اور درخائم کو کس طرح پڑھنا چاہیے۔ اس لیے ازسرنو سوچنے کے لیے مارکس کے ان کاموں پر زور دینے کی شرط عائد کی گئی جو یورپ مرکزیت ظاہر کرتے ہیں، یا ویبر کے ان مضامین کو منتخب کیا گیا جو ان کے خلاف عائد الزامات کو ثابت کرتے ہیں یا غلط قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مارکس کی Contribution to the Critique of Political Economy اور Grundrisse (بمعنی منزل کی منصوبہ بندی) کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم نے پیداوار کے ایشیائی انداز پر مارکس کی بحث اور بھارت میں نوآبادیت پر ان کی گفتگو کا بھی انتخاب کیا (مارکس اینڈ انجلز، ۱۹۶۸ء)، وہ موضوعات جنہیں عموماً عمرانیاتی نظریات کے نصاب سے نکال دیا جاتا ہے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ ان موضوعاتی معاملات کے ساتھ اس برتاؤ کے ذریعے ہم ان کاموں میں یورپ مرکزی تعصب کے اثرات سمجھنے کی توقع رکھتے ہیں۔

چنانچہ کہیں کہیں نصاب کی ازسرنو سمت بندی کی زیادہ ضرورت بنتی ہے کیونکہ ہم نے دیکھا کہ یورپی مرکزیت صرف یورپی علوم ہی میں نہیں ہے بلکہ اس نے مختلف انداز میں غیر مغربی معاشروں میں عمرانی علوم کی ترقی پر بھی اثر ڈالا ہے مثلاً:

(ا) اپنی تاریخ کے بارے میں معلومات کی کمی جس کا اظہار نصابی کتب سے ہوتا ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں استعمال ہونے والی نصابی کتب میں ان خطوں کے بارے میں معلومات کم ہوتی ہیں کیونکہ یہ نصابی کتب ہمیشہ امریکہ یا برطانیہ میں لکھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اپنے خاندان کے مقابلے میں قبل از عہدِ جدید کے یورپی خاندان کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمرانیات جاگیردارانہ نظام کے سرمایہ دارانہ نظام میں بدلنے کے عہد میں تشکیل پائی، اسی لیے یورپ کا

تاریخی تناظر متعین ومخصوص ہے۔ عام ترقی کو جاگیردارانہ سے سرمایہ دارانہ نظام کی جانب منتقلی کی صورت میں متعین کر دیا گیا؛ اس لیے اسے پڑھنا ایک عام سی چیز ہے۔ مطالعے کا مقصود عام ترقی کے اس تعصب میں بالکل معیّن ہے۔ ہمارے معاشروں میں جہاں جدید سرمایہ دارانہ معاشروں کا مطالعہ بھی ترجیحات میں شامل ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہم یورپ کے قبل از سرمایہ دارانہ معاشروں سے شروعات کرتے ہیں اور اپنے قبل از سرمایہ دارانہ نظام کے معاشروں پر توجہ صرف اس لیے مبذول کرتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح جدیدیت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔

(ب) یورپی مرکزیت کے ذریعے، ہمارے معاشرے کی صورت گری کی گئی جسے ہم حقیقت سمجھتے رہے جب تک کہ یورپ مرکزی تحقیقوں نے متبادل تصورات نہیں پیش کیے جو خود بھی اتنے ہی 'یورپ مرکزی' ہو سکتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اقدار، رویے اور ثقافتی نمونے مجموعی طور پر جدت کے عمل میں مکمل طور پر بدل جاتے ہیں اور یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں (روڈلف اینڈ روڈلف، ۱۹۶۷ء، کاہن، ۱۹۷۹ء)۔ لیکن ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں مشرقی ایشیا میں زبردست ترقی کے تجربے کے بعد روایتی ثقافت کے نمونوں مثلاً کنفیوشس مت کو ترقی کا عنصر قرار دیا گیا۔ البتہ ۱۹۹۷ء میں ایشیائی مالیاتی بحران کے آغاز میں اسی کنفیوشس مت اور ایشیائی اقدار کو اقتصادی زوال کے اسباب میں شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

(ج) اصلی نظریہ کاری کی کمی: نظریہ، اصولیات اور تجرباتی تحقیق پر کام زیادہ تر شمالی امریکہ اور یورپ سے آنے کی وجہ سے درآمد شدہ نظریات، تکنیک اور تحقیقی ایجنڈوں کا استعمال بہت زیادہ ہے۔

مندرجہ بالا تین مسائل کو ذہن میں رکھیں، یہ ہمارے طلبہ کو سمجھایا گیا کہ انہیں (ا) عمرانیاتی نظریے کی تخلیق کا پس منظر ذہن میں رکھنا چاہیے؛ (ب) اپنے (غیر مغربی) سیاق وسباق میں مطالعے کے لیے اس کی افادیت کو جانچنا چاہیے؛ اور (ج) عمرانیاتی نظریے کے یورپ مرکزی پہلوؤں سے آگاہ رہنا چاہیے، جو اس کی علمی قدر کو گھٹا سکتے ہیں۔

نصاب میں یورپی مرکزیت کے موضوع سے نمٹنے کے لیے ہم اپنے طلبہ کو مارکس، ویبر اور درخائم کے کاموں کے مخصوص تناظر میں مندرجہ ذیل انداز میں جائزہ پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یہاں مارکس کو پیش کرتا ہوں۔

مارکس کا ایک حصہ گو کہ روایتی موضوعات — جیسا کہ جاگیردارانہ نظام سے سرمایہ دارانہ نظام کی جانب منتقلی، سرمائے کی گردش اور پیداوار، انتقال جائیداد، طبقاتی شعور، ریاست، اور نظریے — کا احاطہ کرتا ہے، وہیں مندرجہ بالا کے حوالے سے لیکن باہم متعلق تین مقاصد کو مجسم کرنے کی کوشش بھی تھی۔ مثال کے طور پر جاگیردارانہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیلی پر مارکس کی گفتگو کا تعلق ظاہر کرتا ہے کہ جاگیردارانہ معاشرے میں ایک ابھرتا ہوا بورژوا طبقہ اور ایک کمزور غیر مرکزی ریاست سرمایہ دارانہ نظام کے ابھرنے کی اولین شرط بنا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہی حالات غیر یورپی معاشروں میں بھی پیدا ہوں۔ ہم اپنے طلبہ کی توجہ مزید سوالات کی جانب مبذول کرواتے ہیں: یہ کس حد تک درست ہے اور کس حد تک ایک 'یورپ مرکزی' نقطۂ نظر ہے؟

'یورپ مرکزی' مفروضوں کے ساتھ یورپ ایک انوکھا مقام ہے، یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ یہ لازمی شرائط یورپ سے باہر نہ ملیں اور یورپ سے باہر قبل از سرمایہ دارانہ نظام کی پیداواری شکل سرمایہ دارانہ ترقی میں رکاوٹ ہو۔ ایک مثال پیداوار کا ایشیائی انداز ہے جس پر طلبہ کو مطالعے کے لیے مواد دیا جاتا ہے۔

لیکچروں میں پیداوار کے ایشیائی انداز کو نمایاں کیا جاتا ہے، کہ مارکس 'ایشیائی' معیشتوں اور معاشروں کی خصوصیات بیان کرنے میں درحقیقت غلط تھے، اور اپنی سیاسی معیشت کو تقویت پہنچانا مستشرقانہ مفروضے تھے جس میں غیر یورپی معاشروں کو یورپ کا الٹ دکھایا گیا۔ ان چیزوں کو تناظر میں رکھنے کے لیے مارکس کی ہندوستانی معاشرے کی خصوصیات بیان کرنے اور پیداوار کے ایشیائی انداز کے بارے میں حیرت انگیز سوچ کو ذہن میں رکھیں، ہم نے یہ بھی نشاندہی کی کہ 'پیداواری انداز' پر مارکس کا خیال محدودیت کے باوجود عمرانیاتی تجزیے کے انتہائی قریب ہے۔ پھر بھی ہم نے زور دیا

کہ پیداوار کے ایشیائی انداز پر مارکس کی گفتگو کی محدودیت کو تسلیم کرنا اہم ہے کیونکہ یہ ان کے کاموں کی ہم عصر تفہیم کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے اور ایشیائی اور/ یا ہندوستانی معاشرے کے معین تصورات کو دوام بخشتا ہے۔

مارکس میں 'یورپ مرکزی' عناصر پر گفتگو مارکسی نظریے کے آفاقی پہلوؤں کو برقرار رکھتے ہوئے سنگاپور یا جنوب مشرقی ایشیا کے ماضی کے بارے میں ناقدانہ مطالعے کے ذریعے ممکن ہے۔ مثال کے طور پر برطانوی ملایا میں نوآبادیاتی تصور کے بارے میں ایک مضمون مخصوص کیا گیا تھا (ہرشمان، ۱۹۸۶ء)۔ یہاں نوآبادیاتی سرمایہ داریت کے یورپ مرکزی پہلوؤں پر تنقید کے لیے مارکسی نظریے کی طرز فکر کے فائدے کا مظاہرہ کرنا ممکن تھا، جس میں مارکس نے خود بھی حصہ ڈالا تھا۔

ہم طبقاتی شعور، ریاست اور نظریے جیسے موضوعات سے نمٹتے ہوئے ہم عصر تیسری دنیا کے معاشروں اور جنوب مشرقی ایشیا کے خطے پر مطالعے کو بھی شامل رکھتے ہیں تاکہ طلبہ اپنے علاقوں کے علاوہ دیگر خطوں اور علاقوں سے مارکس کے نظریات کی مطابقت کو دیکھ سکیں۔ اس لیے یہ مارکس میں یورپ مرکزیت کے انکشاف کے لیے اور ساتھ ساتھ ان کے کام کے آفاقی عناصر اور نظری حیثیت کو محفوظ کرنے ایک مشترکہ کوشش تھی۔

اسیر ذہن، تعلیمی انحصاریت اور تدریس

اس موضوع میں میری دلچسپی اپنے مرحوم والد سید حسین العطاس (۱۹۲۸ء تا ۲۰۰۷ء) کی وجہ سے تھی جو ترقی پذیر معاشروں میں دانشوروں کے کردار کے حوالے سے تاعمر کام کرتے رہے۔ انہوں نے اس موضوع پر متعدد کتب تحریر کیں جنہوں نے (Captive Mind) ''اسیر ذہن'' (العطاس، ایس ایچ، ۱۹۶۹اے، ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۴ء) اور (Inellectual Imperialism) ''دانشورانہ استعماریت'' (۱۹۶۹بی، ۲۰۰۰ء) جیسے موضوعات پیش کیے۔

دانشورانہ استعماریت کا خیال تعلیمی انحصاریت کو سمجھنے کے لیے ایک اہم نقطۂ آغاز ہے۔

العطاس کے مطابق دانشورانہ استعماریت سیاسی و اقتصادی استعماریت سے مشابہ ہے جو افکار کی دنیا میں ایک شخص کا دوسرے فرد پر غلبہ کہلاتی ہے۔ دانشورانہ استعماریت نوآبادیاتی عہد میں زیادہ براہِ راست تھی، جبکہ آج اس کا زیادہ تر تعلق مغرب کی سماجی سائنسی معلومات کے بہاؤ پر گرفت اور اس پر اثر انداز ہونے پر ہے، بجائے اس کے کہ تعلیمی اداروں کو ملکیت میں یا قبضے میں رکھا جائے۔ سیادت و برتری کی یہ قسم 'مغرب کی جانب سے نوآبادیاتی غلبے کی مدد سے نہیں حاصل کی گئی، بلکہ سابق نوآبادیاتی خطوں کے علماء اور منصوبہ سازوں کی جانب سے پر اعتماد انداز میں اور پورے جوش و ولولے کے ساتھ از خود قبول کی گئی ہے حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جو اس عرصے میں بدستور آزاد رہے تھے'

دانشورانہ استعماریت تعلیمی انحصاریت کے تناظر میں وجود رکھتی ہے۔ تعلیمی انحصاریت کا نظریہ سماجی علوم کی عالمی حالت کے اصول قائم کرتا ہے۔ تعلیمی انحصاریت سے مراد ایسی صورت ہے جس میں سماجی علوم کی مخصوص برادریوں کے لیے معلومات کی تخلیق کا انحصار دیگر دانشور برادریوں کی معلومات کی ترقی و نشوونما پر ہو۔ دو یا اس سے زیادہ سائنسی برادریوں کے درمیان باہمی انحصاریت کا یہ تعلق اور ان کے درمیان اور عالمی سطح پر معلومات کا یہ لین دین انحصاریت کی ایک ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جہاں سائنسی برادریاں (جو معلوماتی قوت کے مراکز میں واقع ہوں) ترقی و پیشرفت کے مخصوص معیار کے مطابق بڑھ سکتی ہیں، جبکہ دیگر سائنسی برادریوں کو (جیسا کہ ترقی پذیر معاشروں میں ہوتی ہیں) اس ترقی کا صرف عکس ہی مل سکتا ہے، جو اسی معیار کے مطابق ان کی ترقی پر منفی اثرات رکھتا ہے۔

تعلیمی انحصاریت کی یہ تعریف اقتصادی انحصاریت کے بالکل متوازی ہے جس کے بارے میں تیوتونیو دوس سانتوس (Teotonio Dos Santos) نے کہا تھا:

'انحصار سے ہماری مراد ایسی صورتحال ہے جس میں مخصوص ممالک کی معیشت کسی اور معیشت کی ترقی و پیشرفت سے مشروط ہو، جس کا پہلا ملک مطیع ہے۔ دو یا اس سے زیادہ معیشتوں کی باہمی انحصاریت کا یہ تعلق، ان کے اور عالمی تجارت کے درمیان انحصاریت کی ایک شکل اختیار کرتا ہے جہاں چند ممالک (غالب ملک) توسیع پا سکتے ہیں اور خود انحصار ہو سکتے ہیں جبکہ دیگر ممالک (محتاج) کو اس

توسیع کا محض پرتو ہی مل سکتا ہے، جو ان کی فوری ترقی پر مثبت اور یا منفی اثر ڈال سکتا ہے' (دوس سانتوس، ۱۹۷۰ء:۲۳۱)

اس انحصاریت کا نفسیاتی پہلو، جسے سید حسین العطاس نے اسیر ذہن یعنی ذہنی غلامی کا نام دیا ہے، یہ ہے کہ تعلیمی طور پر انحصار کرنے والا محقق تحقیقی ایجنڈے، نظریات اور طریقوں کے لیے معلومات کی حامل قوتوں کا غیر موثر وصول کنندہ بن جاتا ہے (العطاس، س ف، ۲۰۰۳ء:۶۰۳)۔ گیریو اور چیکی کے مطابق یہ کوئی اتفاق نہیں کہ بڑی اقتصادی قوتیں ہی ہمیشہ بڑی سماجی علوم کی قوت کے مراکز ہوتی ہیں (گیریو، ۱۹۸۵ء:۶۴، ۸۱، ۸۹: چیکی، ۱۹۸۷ء بھی دیکھیں)، البتہ یہ بات صرف آدھا سچ ہے کیونکہ چند معاشی قوتوں کا سماجی علوم کی پیداوار میں حصہ معمولی ہی رہا ہے، جاپان اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

اپنے گزشتہ کام میں میں نے تعلیمی انحصاریت کے چھ پہلو بیان کیے تھے۔ یہ (الف) خیالات پر انحصار؛ (ب) خیالات کے ذریعے پر انحصار؛ (ج) تعلیم کی ٹیکنالوجی پر انحصار؛ (د) تحقیق و تدریس کے لیے امداد پر انحصار؛ (ہ) تعلیم میں سرمایہ کاری پر انحصار؛ اور (و) ترقی پذیر معاشروں میں محققین کی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر معلومات کے مراکز میں طلب پر انحصار (العطاس، ایس ایف، ۲۰۰۳ء: ۶۰۴)۔ میں ایک ساتویں جہت بھی پیش کرنا چاہوں گا، وہ ہے قدر شناسی پر انحصار۔

ہمارے کام کی قدر شناسی کی انحصاریت ہمارے جرائد اور جامعات کی بین الاقوامی درجہ بندی میں شمولیت پر ہے۔ ہماری جامعات اور جرائد درجہ بندیوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادارہ جاتی ترقی کے ساتھ ساتھ درجہ بندی نظام میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کرنے کے لیے انفرادی جائزے بھی کیے جاتے ہیں، جہاں ضروری فوائد فراہم کرنے کے لیے انعامات و سرزنش کا ایک نظام ہے جو ترقی، عہدے کی میعاد اور بونسز کے گرد گھومتا ہے۔ اس قسم کی انحصاریت کے نتائج میں شامل ہیں:

۱۔ مقامی جرائد میں تحقیقی مقالات کی اشاعت کی حوصلہ شکنی کرنا کہ مقامی جرائد بین الاقوامی

درجہ بندی میں مندرج نہیں ہوتے۔

۲۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مقامی جرائد کی قدر میں کمی ہوتی ہے اور سائنسی مباحث مقامی زبانوں تک محدود رہتے ہیں اور ترقی نہیں کر پاتے۔

مسئلہ سماجی علوم کی تدریس کے متبادل طریقوں کو سامنے لے کر آنا نہیں۔ نہ ہی اس سلسلے میں مناسب و متعلقہ نصابی کتب اور مطالعے کی ترویج کا کوئی مسئلہ ہے۔ یہ کام بآسانی ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس مسئلہ ذہنی اسیری کا نفسیاتی مسئلہ اور بناوٹی پابندیوں میں مضمر ہے جس کی جڑیں تعلیمی انحصاریت میں ہیں۔

نتیجہ

جوس رزال اور ابن خلدون نیز ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ، مشرقی یورپ اور ساتھ ساتھ یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی ان جیسے محققین کو سامنے لانے کا مقصد عمرانیات کی آفاقیت میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔ عمرانیات ایک عالمی تعلیم ہے لیکن یہ اس وقت تک آفاقی نہیں ہوگی جب تک کہ کچھ کہنے کی خواہاں مختلف تہذیبوں کی آوازوں کو ہمارے ان اداروں اور طریقوں کے ذریعے سننے کے قابل نہیں بنایا جائے گا۔

گو کہ عمرانیات میں استشراقیت کی تنقید مشہور و معروف ہے، لیکن اسے دنیا بھر کی بیشتر جامعات میں سماجی علوم کے مرکزی نصاب میں بیان کرنا ابھی باقی ہے۔ سماجی علوم میں بنیادی تعارفی کورسز عام طور پر امریکہ یا برطانیہ کے نظری زاویوں، توضیحات اور علمی مواد کے حق میں متعصب ہیں۔ دوسری جانب سماجی علوم میں استشراقیت کی تنقید کا منطقی نتیجہ متبادل خیالات و نظریات کی تیاری ہے جو ماخذ کی حیثیت سے مغربی تہذیب کی حدود کے پابند نہیں۔ لیکن اسے مکمل کرنے کے لیے مشرقیت کی تنقید کو سماجی علوم کی تدریس میں وسیع عالمگیر موضوع بننا چاہیے۔

[سید فرید العطاس نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور میں ملائے علوم کے شعبہ کے سربراہ اور عمرانیات کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔]

(ترجمہ: فہد کیہر)

Source: Third World Resurgence No. 266/267, October/November 2012, pp 32-38

.....کتابیات.....

- Alatas, Syed Farid. 2003. 'Academic Dependency and the Global Division of Labour in the Social Sciences', *Current Sociology* 51(6): 599-613.
- Alatas, Syed Farid. 2006. *Alternative Discourses in Asian Social Science: Responses to Eurocentrism*, New Delhi: Sage.
- Alatas, Syed Farid. 2009. 'Religion and Reform: Two Exemplars for Autonomous Sociology in the Non-Western Context', in Sujata Patel, ed., *The ISA Handbook of Diverse Sociological Traditions*, London: Sage.
- Alatas, Syed Farid & Vineeta Sinha. 2001. 'Teaching Classical Sociological Theory in Singapore: The Context of Eurocentrism', *Teaching Sociology* 29(3): 316-331.
- Alatas, Syed Hussein. 1969a. 'The Captive Mind and Creative Development', in KB Madhava, ed., *International Development*, New York: Oceania Publications.
- Alatas, Syed Hussein. 1969b. 'Academic Imperialism'. Lecture delivered to the History Society, University of Singapore, 26 September.
- Alatas, Syed Hussein. 1972. 'The Captive Mind in Development Studies', *International Social Science Journal* 34(1): 9-25.
- Alatas, Syed Hussein. 1974. 'The Captive Mind and Creative Development', *International Social Science Journal* 36(4): 691-699.

- Alatas, Syed Hussein. 2000. 'Intellectual Imperialism: Definition, Traits, and Problems', *Southeast Asian Journal of Social Science* 28(1): 23-45.
- Alatas, Syed Hussein. 2006. 'The Autonomous, the Universal and the Future of Sociology', *Current Sociology* 54(1): 7-23.
- Chekki, DA. 1987. *American Sociological Hegemony: Transnational Explorations,* Lanham: University Press of America.
- Dos Santos, Teotonio. 1970. 'The Structure of Dependence', *The American Economic Review*, LX.
- Freyre, Gilberto. 1956. *The masters and the slaves (Casa-grande & Senzala): a study in the development of Brazilian civilization,* New York: Knopf.
- Garreau, Frederick H. 1985. 'The Multinational Version of Social Science with Emphasis Upon the Discipline of Sociology', *Current Sociology* 33(3): 1-169.
- Hirschman, Charles. 1986. 'The Making of Race in Colonial Malaya: Political Economy and Racial Ideology', *Sociological Forum* 1(2): 330-361.
- Kahn, Herman. 1979. *World Economic Development: 1979 and Beyond,* London: Croom Helm.
- Marx, Karl & Frederick Engels. 1968. *On Colonialism,* Moscow: Progress Publishers, pp. 35-41; 81-87.
- de Morga, Antonio. 1890/1991. *Sucesos de las Islas Filipinas por el Doctor Antonio de Morga, obra publicada en M¢jico el a□o de 1609, nuevamente sacada a luz y anotada por Jos, Rizal y precedida de un pr¢logo del Prof. Fernando Blumentritt,* Edici¢n del Centenario, impression al offset de la Edici¢n Anotada por Rizal, Paris 1890, Escritos de Jos, Rizal Tomo VI, Manila: Comision Nacional del Centenario de Jos, Rizal, Instituto Hist¢rico Nacional. For the English translation, see de Morga (1890/1962).
- de Morga, Antonio. 1890/1962. *Historical Events of the Philippine Islands by*

Dr Antonio de Morga, Published in Mexico in 1609, recently brought to light and annotated by Jose Rizal, preceded by a prologue by Dr Ferdinand Blumentritt, Writings of Jose Rizal Volume VI, Manila: National Historical Institute.

- Rizal, Jos,. 1963a. 'The Indolence of the Filipinos', *Political and Historical Writings,* Manila: National Historical Institute, pp. 111-139.
- Rizal, Jos,. 1963b. 'The Truth for All', *Political and Historical Writings,* Manila: National Historical Institute, pp. 31-38.
- Rudolph, Lloyd & Susanne Rudolph. 1967. 'The Place of Tradition in Modernization', *Development Digest,* Washington, DC: National Planning Association, pp. 62-66.
- Wallerstein, Immanuel. 1996. 'Eurocentrism and Its Avatars: The Dilemmas of Social Science'. Paper presented to Korean Sociological Association-International Sociological Association East Asian Regional Colloquium on 'The Future of Sociology in East Asia', Seoul, 22-23 November.